رفیق رازؔ کا شعری آئینہ

نخلِ آب کے تخلیقی پیرایے میں

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

چند حرفوں نے بہت شور مچا رکھا ہے
یعنی کاغذ پہ کوئی حشر اٹھا رکھا ہے
(نخلِ آب...ص۱۵۴)

شاعر کا مقام متعین کرنے میں مخصوص شعری بصیرت (Poetic Vision) بنیادی اہمیت رکھتی ہے، جسکی پہچان منفرد شعری لہجہ، تخئیل آفرینی، تخلیقی اسلوب (Creative style) اور فنی ہنرمندی وغیرہ خصائص میں پوشیدہ ہوتی ہے، نہیں تو کتنے لوگ شعر کہتے آئے ہیں اور کتنے شعر کہہ کے چلے بھی گئے لیکن صرف چند ہی اس تخئیلی سلطنت میں اپنی نشستیں سنبھالنے میں کامیاب رہے۔ عصری اردو شعری منظرنامے میں رفیق راز اپنے منفرد شعری لہجے، تخئیل آفرینی، تخلیقی اسلوب اور فنی ہنر مندی کے خصائص کی بدولت مخصوص مقام بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ رفیق راز صاحب کے فنی اختصاص پر معروف نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی گفتگو کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

'' غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی در کار ہے، بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز ان شعراء میں نمایاں ہیں جنہوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔'' (مجموعہ انہار...سرورق)

منفرد اسلوب و لہجے کا یہ نمایاں مقام چند برسوں کی ریاضت کا ثمر نہیں بلکہ اس مقام کی بنیاد کئی دہائیوں کی فنی ریاضت، تخلیقی جگر سوزی اور مشاہداتی و تجرباتی عرق ریزی پر قائم ہے، جس کا اندازہ ''نخلِ آب'' کے تخیلی عالم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مجموعہ ''انہار'' اور ''مشراق'' کے بعد ''نخلِ آب'' راز صاحب کی شعری بصیرت کے کئی تخلیقی رازوں کو منکشف کر رہا ہے:

ترتیب ہی الگ ہے مرے شہرِ ذات کی
شعلہ تو اک ثمر ہے یہاں نخلِ آب کا

دنیا کی ان مثالوں میں رکھا ہے کیا جناب
اک دو حوالے دیجئے دل کی کتاب سے

لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں امیں ہوں میں دردِ عظیم کا

کسی بھی تخلیقی متن کا تخلیقی برتاؤ متن کو ادبی اعتبار بخشنے میں بنیادی رول نبھاتا ہے اور قاری جب تنقیدی نقطۂ نگاہ سے تخلیقی متون پر ارتکاز کرتا ہے تو 'اکتشافی تنقید' کے

پیش نظر قرأت کے دوران تخلیق کار کا یہی تخلیقی برتاؤ (Creative treatment) لفظ و معنی کے دلچسپ تجربے سامنے لاتا ہے اور معیاری تخلیق تفہیم کی متنوع جہتیں کھول دیتی ہے۔ لسانی سطح پر دیکھیں تو لفظوں اور تراکیب کا استعمال ایک قسم کا لسانی عمل (Language proccess) ہوتا ہے اور یہ عمل ہر زبان کے بڑے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ اب اس توضیح کے پیش نظر پہلے شعر کو زیر بحث لائیں:

ترتیب ہی الگ ہے مرے شہرِ ذات کی
شعلہ تو اک ثمر ہے یہاں نخلِ آب کا

تو یہاں پر بھی لسانی عمل کا یہ تخلیقی وتصریفی برتاؤ دلچسپ تجربے کی عکاسی کرتا ہے۔ شعری کردار پہلے ہی مصرعے میں 'شہرِ ذات' کی ترتیب یعنی اپنے قلبی احوال اور افکار کی انوکھی ترتیب کا دعویٰ کرتا ہے اور تخئیل کی بنیاد پر اپنے دعوے کا راز دوسرے مصرعے میں 'نخلِ آب' کی نرالی ترکیب اور شعلہ وثمر جیسے مانوس الفاظ کے وجدانی تجربے میں پوشیدہ رکھتا ہے تاکہ باذوق قاری شعر کی تہہ داری میں کھو کر تفہیم کی شروعات کرے۔ اب یہاں پر پہلے 'نخلِ آب' کی تصوراتی امیج یا فینٹسی (Fantasy) پر غور کریں تو یہ لسانی عمل کا خوشگوار تاثر چھوڑ رہا ہے۔ بظاہر یہ ترکیب مانوس الفاظ یعنی نخل (کھجور کا درخت یا اردو لغت میں عام درخت) اور آب (پانی) کا مرکب معلوم ہوتی ہے اگرچہ عربی میں بھی نخل بطور فعل ''نخل السحاب المطر ''یعنی بادل کا پانی برسانا' استعمال ہوتا ہے لیکن جب بحیثیت ترکیب ''نخلِ آب'' اور پھر شعر میں اس کے تخلیقی استعمال پر غور کریں تو تفہیم کا مسئلہ ذرا سا نازک بن جاتا ہے۔ نخلِ آب کی ترکیب پر مجھے یورپی ملک مانٹی نیگرو (Montenegro) کا

ایک پیڑ یاد آیا جو آبشار کی طرح پانی چھوڑتا ہے جو کہ Water Tree کے نام سے مشہور ہے اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے تو لفظی معنی کے طور پر دونوں تراکیب میں گرچہ مماثلت نظر آتی ہے تاہم ممکن ہے کہ یہ تصور شاعر کے تخئیل میں کسی فوارہ کا نظارہ کرنے کے دوران ابھرا ہو کیونکہ آج کل فواروں کی ڈئزائنگ بھی ایسی ہوتی ہے کہ لگتا ہے جیسے پیڑ کی شاخیں پانی چھوڑ رہی ہوں' اس کے باوجود شعر میں یہ ترکیب جس ممکنہ مفہوم یا تجربے کی عکاسی کرتی ہے' اس سے لگتا ہے کہ یہ شاعر کی ذہنی اختراع ہے جس کو شعر کے اندر تخلیقی انداز میں بڑی ہنرمندی سے برتا گیا ہے اور 'نخلِ آب' کے قرین قیاس استعاراتی معنی دیدۂ تر بن جاتا ہے' اب اس شعری ترکیب کے تصوراتی اور تخلیقی معنویت پر ارتکاز کریں تو نخلِ آب بمعنی دیدۂ تر (بھیگی آنکھیں) جو کہ اب جور وستم سے تنگ آ کر شعلہ بن گئی ہیں یعنی جب کسی کمزور انسان پر بار بار ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں تو صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے بعد وہ بھی دفاع کرنے یا بدلہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ پانی سے شعلہ بن جاتا ہے۔اس طرح شعر میں شاعرانہ تدبیر کاری (Poetic Devices) کے استعمال اور شعر کی معنوی جہت کا احاطہ کریں تو شاعر کہتا ہے کہ میرے شہرِ ذات یعنی خوشگوار زندگی (کیونکہ شہر کا استعارہ بذات خود خوشگوار احساس یا زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔) گزارنے کے طور طریقوں کو گردش زمانہ نے مثبت سے منفی بنا دیا کیونکہ پہلے جو نخلِ آب فوارے کی طرح فرحت بخش نظارہ دکھاتا تھا اب وہی آگ کے شعلے برسا رہا ہے یا پہلے جن آنکھوں میں شبنمی چمک ہوتی تھی اب وہ شعلہ برسانے لگی ہیں۔تصوراتی طور پر شعر تجریدی اسلوب کی عکاسی کرتا ہے لیکن معنوی تناظر میں معنی خیز علامتی تفہیم پیش کرتا ہے جو کہ ایک عمدہ شعر کی طرح متحد المفہوم کے بجائے متنوع

المفہوم معنی انگیز کرنے کی نشانی ہے۔

رفیق راز کے بیشتر اشعار مشاہداتی تجربے کی دلکش فنی عکاسی کرتے ہیں۔ان میں جذبات انگیز سطحی خیالات نہیں بلکہ سنجیدہ فکر کا مدبرانہ اظہار ہوتا ہے۔ وہ خارجی یا ظاہری شور شرابے کے برعکس داخلی سکوت کی دنیا پسند کرتے ہیں' اسلئے ملائم لہجے میں دنیا کی مثال پر'دل کی کتاب' کے حوالے کو فوقیت دیتے ہیں۔کیونکہ جب انسان کا دل مطمئن ہو تو پھر دنیا کی شان وشوکت بھی اطمینان کا باعث بنتی ہے اور اگر یہ شان و شوکت دل کی ویرانی کا سبب بنے تو پھر صاحب بصیرت روحانی کرب کا شکار ہوجاتے ہیں:

دنیا کی ان مثالوں میں رکھا ہے کیا جناب
اک دو حوالے دیجئے دل کی کتاب سے

اسی قسم کے ایک حکمت آمیز اصلاحی شعر میں لسان العصر اکبرالہ آبادی نے بہت پہلے اشارہ کیا تھا:

نقشوں کو تم نہ جانچو' لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے' کیا چیز مر رہی ہے

بسا اوقات کسی تخلیق کار کی مخصوص ترکیب' استعارہ یا علامت کا مسلسل استعمال بڑا سودمند ثابت ہوتا ہے اور اس کی فنی شناخت کا استعارہ بھی بن جاتا ہے۔کلامِ راز میں ایک مانوس لفظ ''سکوت'' اور اس کے انسلاکات بار بار اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔کبھی یہ متحرک صورت میں 'بوئے سکوت' بن جاتا ہے اور کبھی 'گوشۂ سکوت' سے نکل کر 'شعلۂ سکوت' میں ڈھل جاتا ہے اور سکوت کا یہ تصوراتی عالم کلامِ راز میں اسقدر چھایا ہوا کہ محسوس ہوتا ہے کہ 'سکوت' کلامِ راز کا تخلیقی استعارہ بن گیا ہے:

بوئے سکوت خانۂ افسردگاں سے آئے
موج نسیم شہرِ میں آئے جہاں سے آئے
اٹھتا نہیں ہے گر کے کبھی پردۂ سکوت
ہوتا نہیں ہر اک پہ عیاں گوشۂ سکوت
یا رب سیاہ پوش نہ ہو شعلہ ٔ سکوت
روشن تمام رات رہے خیمہّ سکوت

شاعری تجربات کا فن ہے اور یہ فن تجربات ومشاہدات کی پیش کش کے لئے فنی لوازمات کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ کسی بھی باشعور انسان کے افکار مقامی ماحول یا حالات وواقعات کی اثر انگیزی سے بچ نہیں سکتے ہیں اور جب کوئی حساس فن کار ایسے ماحول میں سانسیں لیتا ہے تو ان حالات وواقعات کا مشاہداتی اظہار وہ اپنی تحریر/تخلیق میں کرتا ہے؛ جس کا اظہار ساحر لدھیانوی نے دلچسپ انداز میں یوں کیا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

انہیں تجربات ومشاہدات کا فنی اظہار راز صاحب بھی دل فگار انداز میں کرتے ہوئے خود کو شاعر کی بجائے 'دردِ عظیم' کا 'امیں' کہہ کر کہتے ہیں کہ میں اپنے کلام میں وہیں امانتیں لوٹا رہا ہوں جو وقت نے مجھے سونپی تھیں۔ شعر کی موضوعاتی مماثلت دیکھ کر ''خدائے سخن'' میر تقی میرؔ کا مشہورِ زمانہ شعر یاد آتا ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

شعر میں لفظ وخیال کا متوازن استعمال نظر آتا ہے یعنی امانتیں' امیں' شاعر'

دردِعظیم ۔ امانتیں تو زیادہ تر مادی تصور کی عکاسی کرتی ہیں لیکن یہاں پر انہیں سماجی کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور امین بھی مادی امانتوں کے حوالے سے نہیں بلکہ بطور فنی ردعمل جو دردِعظیم کی صورت میں ہے:

لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں امیں ہوں میں دردِعظیم کا

'دردِعظیم' کا یہ امین شاعر جب تجربات ومشاہدات کو فن کے قالب میں ڈالتا ہے تو شعر کے اندر فکرو احساس اور دھیمے لہجے کا طنز آمیز رویہ (Sarcastic attitude) کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور معنوی صورت گری کا ابہامی نقشہ سامنے آتا ہے:

یہ جو ہر سمت ترے نیزے کی شہرت ہے بہت
سچ تو یہ ہے کہ مرے سر کی بدولت ہے بہت

امیر شہر کی دستار نوچ کیا لیں گے
یہ لوگ اپنے سروں کو بچانے لگ گئے ہیں

یہاں رہتے ہیں سر سجدوں میں دائم
یہاں دیتا نہیں کوئی اذانیں

پہلے دو اشعار میں تو شعری کردار طنز آمیز ملائم لہجے میں اور کچھ حد تک مدھم احتجاجی لے میں اپنے حریف جو کہ طاقت کے نشے میں چور ہو کر سوچتا ہے کہ ہر طرف اس کے نیزے (ظلم وتشدد یا دبدبہ) کی شہرت ہے' کے غرور کو یہ کہہ کر للکار رہا ہے کہ

تمہارے گھمنڈ اور شہرت کا احسان تو میری خودداری کا مرہون منت ہے۔ اگر تمہارے نیزے کا مقابلہ میرا سر نہیں کرتا تو تیری شہرت کا نام ونشاں تک نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں فرضی کردار اپنے خوددار سر کی بجائے دوسرے لوگوں کے بزدلانہ کردار یا کمزور سروں پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امیر شہر کے دستار کو نوچنے کی بات چھوڑیئے یہ لوگ تو خود کے سروں کو بچانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح سے اگرچہ مذکورہ دونوں اشعار میں غیر ابہامی رویہ (Anastigmatic attitude) موجود ہے تاہم تیسرے شعر کا متن مثبت اور منفی احساس کے ابہامی یا ذومعنی تاثر (Ambiguous Impression) کا حامل ہے جو کہ قولِ محال (Paradox) کی اچھی عکاسی کرتا ہے:

یہاں رہتے ہیں سر سجدوں میں دائم
یہاں دیتا نہیں کوئی اذانیں

مابعد جدید تنقیدی مکالمے (Post Modern Critical Discourse) کے پیش نظر شعر کی معنویت پر غور کریں تو شعر کا پہلا لفظ 'یہاں' (تابع فعل) اشارۃً شاعر کے اپنے سماجی ماحول کی عکاسی کرتا ہے یعنی کشمیر کے امن پسند ماحول کی' چونکہ کشمیر اپنی مہمان نوازی اور امن پسندی کی بدولت ''پیروں فقیروں' ریشی منیوں'' کی وادی کہلاتا ہے (اگرچہ گردش زمانہ نے اب ماحول میں بھی نئی گردش لائی ہے) تو شعر کا پہلا امکانی معنی یہ نکلتا ہے کہ یہاں کے لوگ ہمیشہ اپنے سروں کو ندامت اور عجز سے جھکائے رہتے ہیں نہ کہ تکبر وغرور کے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ایک طرح سے بین المتن (Inter text) تصوف پسند فکر بھی موجود ہے تاہم شعر کے دوسرے معنی طنز (Irony) کی بھی اچھی عکاسی کرتا ہے کہ یہاں

کے لوگ سر جھکا کر چلنے کے عادی ہیں کیونکہ ان کی فطرت آمنا وصدقنا یا آنکھیں بند کر کے ہر بات کو تسلیم کرنے کی عادی ہو چکی ہے اس لئے یہاں کی فضا انقلاب آفریں آوازوں یا نعروں سے محروم ہو چکی ہے۔شعر میں لفظ ''اذانیں'' اپنے اصلی معنی سے نکل کر مرادی معنی کی صورت میں بغاوت یا انقلابی آواز کا استعارہ بن گیا ہے۔اس توضیح کے باوجود شعر کی یہ فنی وموضوعاتی معنویت خوشگوار تاثر چھوڑ جاتی ہے کہ اس کا معنوی اطلاق کسی بھی جگہ یا مقام کی موزوں صورتحال پر ہو سکتا ہے۔

شعر وفکشن کی تخلیق کا مدار فکر وفن (Art and Thought) کے امتزاجی ملاپ پر ہوتا ہے اور فکر وخیال کے تخلیقی برتاؤ کا ہنر کسی بھی تخلیق کار کے اسلوب کو سنوارنے میں نعمتِ عظمیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔اسلوبیاتی تنقید میں کسی بھی متن کے (خصوصاً شعری و افسانوی متن) ساختیاتی رچاؤ میں تخلیق کار کا اسلوبیاتی اظہار (Stylistic Expression) بڑی اہمیت رکھتا ہے اور دوران تجزیہ شعری متن کے صوتی ولفظی، ساختی ونحوی اور فنی ومعنوی لوازمات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ان لوازمات کے زیرِ نظر رفیق راز کی شاعری صوتی ولفظی، ساختی ونحوی اور فنی و معنوی خوبیوں کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔ان کا شعری متن نادر اور اچھوتی لفظیات اور ترکیبوں سے مزین ہے جیسے شعلۂ حنا، نافۂ شعور، رمیدہ ہوا، دشتِ خاموش، تحفۂ حیرت، سیہ سکوت، صحرائے سیاہ، شہرِ ذات، آئینۂ افسوں، مصحفِ ذات، سبزۂ پامال، دیدۂ شیر وغیرہ اور ان ہی تراکیب کی وجہ سے کئی اشعار علامتی روپ اختیار کر گئے ہیں۔غالباً اپنے کلام میں ان ہی نادر ترکیبوں اور علامتی اسلوب کی موجودگی کی جانب شاعر اشارہ کرتا ہے::

کسی پہ حال ہمارا کھلے تو کیسے کھلے

غزل ہی کہتے ہیں بے حد علامتی ہم لوگ
ہمارا طرز بیاں ہے الگ ' جدا اسلوب
سخن کے شہر میں کتنے ہیں اجنبی ہم لوگ

''نخل آب'' کی بیشتر غزلوں میں مذکورہ خصائص کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور فکری وفنی طور پہ کسی بھی معاصر قادر الکلام شاعر کے کلام کے سامنے بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ان خصوصیات کے باوجود بحیثیت قاری چند محسوسات کا اظہار نامناسب نہیں ہوگا۔چونکہ آج کی دنیا' گلوبل ولیج' کہلاتی ہے اور اب شعر وادب کا قاری محدود خطہ تک محدود نہیں رہا بلکہ آج کل سوشل میڈیا اور ای بک وغیرہ جیسے جدید اور اہم برقی وسیلوں کی بدولت کسی بھی زبان کا تخلیق شدہ یا ہو رہے ادب کا مواد راست اور ترجمہ شدہ صورت میں بہ آسانی دستیاب ہے' تو آج کا قاری بدلتی صورتحال کے پیش نظر زیادہ تر وہ ادب پسند کرتا ہے جو کسی خاص علاقے کی سیاسی وسماجی' تہذیبی وثقافتی صورتحال کی عکاسی کرتا ہو اور اس میں مزاحمتی یا احتجاجی ادب کا رجحان توانا نظر آتا ہے۔اس تعلق سے دیکھیں تو رفیق راز کے زیر مطالعہ مجموعے میں چند ہی ایسی مثالیں نظر آتی ہیں جو مزاحمتی یا احتجاجی ادب کے زمرے میں آسکتی ہوں جیسا کہ کشمیر میں تین دہائی کی پُر آشوب زندگی کی عکاسی درجہ ذیل درد بھرے اشعار میں نظر آتی ہے:

جن لبوں پر کبھی روشن تھے صداؤں کے چراغ
ان پہ اک جوئے خموشی بھی رواں دیکھئے گا
صبح کشمیر بھی ہے شام غریباں جیسی
ایک دو دن کے لئے آکے یہاں دیکھئے گا

نوک خنجر پہ یہ تارے یہ گل تر یہ چراغ
دیکھئے ان کو بھلا اور کہاں دیکھئے گا

چونکہ ایک ادیب کا یہ اخلاقی، ادبی اور سماجی فریضہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی زمینی صورتحال کو قلم بند کر کے دوسری اقوام یا نئی نسل تک پہنچائے۔ آج جب ہم بلیک لٹریچر یا مزاحمتی ادب پڑھتے ہیں تو ہی نیگرو اور فلسطین وغیرہ کی زمینی صوتحال سے واقف ہوجاتے ہیں۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی نظر آیا کہ یہ مجموعہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں قریباً ۱۲۵ غزلیں شامل ہیں، اور اردو غزل کا اپنا ایک فنی و ثقافتی مزاج ہے جس میں سریلی لے (Melodious tune) کی اتنی اہمیت ہے کہ اردو کے علاوہ غیر اردو خواں کی سماعتوں میں بھی رس گھول دیتی ہے اور وہ بھی میرؔ و غالبؔ وغیرہ کی غزلوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، تو اس مجموعہ کی غزلیات میں سریلی لے یا غنائیت کی یہ کیفیت خال خال ہی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کلام راز پر فلسفیانہ افکار کا غلبہ نظر آتا ہے اور اس نے سنگلاخ زمینوں کو زیادہ برتا ہے انہوں نے کچھ غزلیں ان بحور میں بھی لکھی ہیں جن کو عام طور پر شاعر چھوتے تک نہیں اور ایسی بحور غیر شگفتہ ہی ہوتی ہیں ۔ بہرحال ان ضمنی باتوں کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ راز صاحب کا کلام فنی تکمیلیت کی اس منزل پر کھڑا ہے جہاں عمومیت کے برعکس انفرادیت کے پھول نظر آتے ہیں اور جو تفہیم و تعبیر سے قاری کی طبعیت کو مہکارتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ راز صاحب کی شاعری ان کے اس شعر کو سچ ثابت کرے گی۔

ہمیں وہ سلطنت حرف کے شہنشہ ہیں
رفیق راز ہمارا ہی نام ہے سائیں